نا محمد حنیف ندوی

اصطلاحاتِ حدیث

— ٢ —

مضطرب

اس حدیث کو مضطرب کہتے ہیں جس کی روایات بایں طور متعدد اور مساوی درجے کی ہوں کہ ان میں کسی کو ترجیح نہ دی جا
۔ تعدد روایات کبھی تو ایک ہی شخص کی وجہ سے ہوتا ہے جب کہ وہ دو یا دو سے زیادہ مرتبہ روایت بیان
ے، اور کبھی رواۃ کی بنا پر — اگر ان روایات میں کسی روایت کو حفظ و ضبط، یا طول سماع کی بنیاد پر ترجیح
ل ہوجائے تو اس صورت میں اس کا ضعف دور ہوجائے گا، اور یہ اضطراب کے دائرے سے نکل جائے گی۔
راب کا تعلق اگرچہ متن سے بھی ہوتا ہے، لیکن اکثر و بیشتر اس کا اطلاق سند ہی پر ہوتا ہے۔

اضطراب فی الاسناد کی مثال حضرت ابو بکرؓ کی یہ حدیث ہے:

قال رسول الله اراك شيبت ـ قال "شيبتني هود و اخواتها"

حضرت ابو بکر نے کہا یا رسول میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ بوڑھے ہو رہے ہیں۔ آنحضرت نے فرمایا، ہاں! مجھے سورہ ہود
اس کی اخوات نے بوڑھا کر دیا ہے۔

دار قطنی نے اس حدیث کو مضطرب قرار دیا ہے کیونکہ یہ صرف ابی اسحاق سے مروی ہے لیکن متعدد انداز
ے۔ کسی نے اس کو ابی اسحاق سے مرسلاً روایت کیا ہے اور کسی نے موصولاً۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا ماخذ مسند
بکر ہے۔ بعض نے اس کا ماخذ مسند سعد بتایا ہے، جب کہ بعض کی رائے میں اس کا تعلق مسند عائشہ سے ہے۔
ں کے رجال سب کے سب ثقات میں سے ہیں، جن میں کسی کو کسی پر ترجیح نہیں۔

بظاہر اس نوع کے اضطراب کے بارے میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اگرچہ اس میں طرقِ روایت میں اختلاف و تعدد
یا جاتا ہے لیکن اس کے رواۃ کا تعلق جب ثقات سے ہے تو کیوں نہ اس کو صحیح احادیث کے زمرے میں شمار کیا
ئے۔ اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ کون طریق زیادہ صحیح اور لائق
تماد ہے، اور کس طریق مرجوح کا اطلاق ترک ہے۔ لہٰذا یہ صحت کے بجائے ضعف پر زیادہ دلالت کناں ہے کیونکہ

ان میں کوئی وجہِ ترجیح پائی نہیں جاتی، جس کی بنا پر ایک کو راجح اور اصح قرار دیا جاسکے، اور دوسری کو متروک و مرجوح۔

اضطراب فی المتن کی مثال انس بن مالک کی یہ روایت ہے۔

قال صلیت خلف النبی صلی اللہ علیہ وسلم و ابی بکر و عمر و عثمان فکانوا یستفتحون "بالحمد للہ رب العلمین" ولا یذکرون بسم اللہ الرحمٰن الرحیم فی اول القرأۃ ولا اٰخرھا۔

ان کا قول ہے کہ میں نے آنحضرت، ابوبکر، عمر اور عثمان کے پیچھے نماز پڑھی، یہ سب نماز کا آغاز الحمد للہ سے کرتے تھے اور ان میں کوئی بھی بسم اللہ نہیں پڑھتا تھا، نہ اول قرأت میں اور نہ آخر قرأت میں۔

اس حدیث میں، متن کا یہ ٹکڑا کہ ان میں کوئی بھی بسم اللہ نہیں پڑھتا تھا، اضطراب لیے ہوئے ہے، کیونکہ بخاری اور مسلم کی متفقہ روایت یہ ہے:

فکانوا یستفتحون القراءۃ بالحمد للہ رب العلمین۔

سب قرأۃ کا آغاز فاتحہ سے کرتے تھے۔

اس میں بسم اللہ پڑھنے کی نفی مذکور نہیں۔ اس صورت میں بلاشبہ اس متفق علیہ حدیث کو مرجح قرار دیا جاسکتا تھا لیکن ایک اور روایت نے اشکال پیدا کر دیا جو حضرت انس سے مروی ہے، اس میں ان کا کہنا ہے کہ بسم اللہ کے بارے میں نفیاً یا اثباتاً آنحضرت سے کوئی روایت محفوظ و ثابت نہیں۔

مضطرب حدیث کو بہرحال ضعیف نہیں کہا جاسکتا۔ اگر اضطراب کے معنی صرف یہ ہوں کہ خود راوی یا اس کے باپ کے نام کے بارے میں اختلاف رونما ہے، لیکن راوی بہرحال ثقات میں سے ہے تو اس صورت میں اُسے صحیح یا حسن کی اقسام میں سے گردانا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ وہی اضطراب موجب ضعف ہوتا ہے جو سند و متن سے متعلق ہو، سند اگر صحیح ہے، اور رواۃ ثقہ ہیں تو اگرچہ اس کو مضطرب بھی کہیں گے، تاہم اضطراب کی یہ نوعیت اس کی صحت پر اثر انداز نہیں ہوگی۔

مقلوب

اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں راوی متن میں کسی لفظ کو بدل دے، یا نام و نسب کو تبدیل کر دے [illegible] کو مؤخر اور متاخر کو متقدم ٹھہرا دے۔ تقلیب کا یہ عمل کبھی متن میں ہوتا ہے اور کبھی [illegible]۔

متن میں تقلیب کی مثال یہ حدیث ہے کہ سات اشخاص ایسے ہیں جو قیامت کے روز اللہ کے سایہ میں ہوں گے، ان میں کا ایک وہ ہے :

ورجل تصدق بصدقة اخفاها حتى لا تعلم يمينه، ما تنفق شماله۔

اور ایک وہ شخص ہے جس نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور اسے اس طرح پوشیدہ رکھا کہ اس کا دایاں ہاتھ یہ نہیں جان پایا کہ بائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا۔

اس روایت میں ترتیب بدل گئی ہے۔ یعنی جو مقدم تھا وہ مؤخر ہو گیا ہے اور جو مؤخر تھا وہ مقدم۔ صحیحین متفق علیہ الفاظ یہ ہیں :

حتى لا تعلم شماله ما تنفق يمينه

اس طرح پوشیدہ رکھا کہ اس کا بایاں ہاتھ نہیں جان پایا کہ دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا۔

اسناد میں تقدیم و تاخیر یوں واقع ہوتی ہے کہ مثال کے طور پر کوئی راوی مرہ بن کعب اور کعب بن مرہ میں فرق روا نہ رکھے۔ حالانکہ ان میں باپ بیٹے کا رشتہ ہے۔ خطیب نے اس موضوع پر اپنی کتاب رفع الارتیاب فی المقلوب من الاسماء والانساب میں خصوصیت سے بحث کی ہے، اور بتایا ہے کہ کہاں کہاں رواۃ نے سلسلہ اسناد اور اسما کی تعیین میں ٹھوکر کھائی ہے۔

تقلیب کی ان دونوں مثالوں میں ترتیب میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے، وہ سہو و نسیان کی وجہ سے ہوئی ہے، کیونکہ عمداً ایسا کرنا افترا پردازی کے زمرہ میں شمار ہوتا ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی وضاع و واعظ سلسلہ اسناد کو اس لیے بدل دیتا ہے کہ لوگوں کی اس خواہش کو پورا کرے کہ وہ ایک متعین شخص کی احادیث کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ مثلاً اگر حدیث سالم بن عبداللہ سے مروی ہو اور مشہور ہو تو وہ اس کو نافع سے مروی قرار دے دیتا ہے، اس لیے کہ عوام نافع کی احادیث کو زیادہ رغبت سے سنتے ہیں۔

تقلیب کی ایک دلچسپ شکل یہ بھی ہے کہ بعض اوقات ایک محدث کے مبلغِ علم و عرفان کا جائزہ لینے کے لیے متون و اسانید میں رد و بدل کیا جاتا ہے۔ خطیب بغدادی نے اس سلسلے میں ایک عمدہ مثال بیان کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ امام بخاری جب بغداد تشریف لائے تو یہاں کے علما کے دل میں اس خواہش نے چٹکی لی کہ ان کو آزمایا جائے اور ان کے علم و اتقان کے جو چرچے ہیں ان کے بارے میں تحقیق کی جائے۔ چنانچہ دس افراد پر مشتمل ایک

مجلس ترتیب دی گئی اور اس کے سپرد یہ کام ہوا کہ یہ سو حدیثوں کو چنیں اور ان کے سلسلۂ اسناد کو اس طرح متغیر کر دیں کہ ہر ہر متن اپنے صحیح سلسلۂ اسناد سے محروم ہو جائے اور پھر ایک ایک کر کے ان احادیث مقلوبہ سے متعلق امام بخاری سے دریافت کیا جائے کہ وہ ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ چنانچہ مقررہ وقت پر آزمائش و امتحان کے اس مرحلے کا آغاز ہوا۔ ان دس آدمیوں میں سے ہر ایک نے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق امام بخاری سے ان احادیثِ مقلوبہ سے متعلق دریافت کرنا شروع کیا۔ ہر سوال کے جواب میں امام بخاری کا ایک ہی جواب تھا — لا اعرف — (میں اس سند کے ساتھ اس حدیث کو نہیں جانتا)۔ یہاں تک کہ سوال و جواب کا یہ سلسلہ ختم ہوا۔

اس کے بعد امام بخاری نے پہلی حدیث سے لے کر آخری حدیث تک ایک ایک کو لیا اور بتایا کہ یہ حدیث اس سلسلۂ اسناد کے ساتھ مروی ہے، اور یہ حدیث اس سلسلۂ اسناد کے ساتھ منقول ہے، اور اس طرح ان لوگوں نے جو اسناد و متون میں تبدیلی کی تھی، اس کا بھید کھل گیا — اس پر علمائے بغداد کو امام بخاری کی فضیلتِ علمی کا اعتراف کرنا پڑا اور ماننا پڑا کہ اس شخص کا حافظہ بلا کا ہے، اور یہ بجا طور پر اس بات کا استحقاق رکھتا ہے کہ احادیث کے ضبط و اتقان کے معاملے میں اس کو سرخیلِ محدثین سمجھا جائے۔

احادیثِ مقلوبہ کو اس بنا پر ضعیف قرار دیا جاتا ہے کہ ان میں ضبط و اتقان کی کمی رونما ہوتی ہے، جس سے سامع غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے۔

شاذ

حدیثِ شاذ کا اطلاق کن معنوں میں ہوتا ہے؟ اس کی تعیین دشوار ہے، اسی وجہ سے علما نے اس موضوع پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی۔ عام طور پر اس میں دو چیزوں کو اہم خیال کیا جاتا ہے، تفرد اور مخالفت۔ یعنی کوئی ثقہ ایسی روایت بیان کرے، جس میں وہ متفرد بھی ہو، اور دوسرے ثقات کی مخالفت بھی کرے۔ ابنِ حجر نے شاذ کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ شاذ اس روایت کو کہتے ہیں جس میں ایک مقبول راوی اپنے سے اولیٰ راوی کی مخالفت کرے، اور کہا ہے کہ اس باب میں یہی تعریف قابلِ اعتماد ہے۔

امام شافعی کا کہنا ہے کہ شاذ ایسی حدیث کو نہیں کہتے جسے ایک ثقہ راوی بیان کرے اور دوسرا نہ کرے، بلکہ شاذ کا اطلاق اس روایت پر ہوگا جس میں راوی ثقات کی مخالفت کرے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ امام شافعی کے نقطۂ نظر کے مطابق شذوذ میں صرف تفرد کا ہونا کافی نہیں، بلکہ تفرد کے ساتھ اس میں مخالفت کا پہلو ہونا بھی

علمائے حجاز نے اسی تعریف سے اتفاق رائے کیا ہے۔ ابن الصلاح نے بھی اسی کی تائید کی ہے اور کہا ہے
تفرد کی صورت میں اگر راوی عادل، ضابط اور حافظ ہے تو اس کی روایت بہرحال مقبول ہوگی، کیونکہ بصورت
دیگر ہمیں بہت سی روایات سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ یہی نہیں بہت سے مسائل، دلائل و مآخذ سے محروم
ہوجائیں گے۔

حافظ ابن قیم نے واضح الفاظ میں اس حقیقت کی تصریح کی ہے کہ شذوذ کے دائرے میں وہی روایا
داخل ہیں جن میں کہ راوی اپنی روایت میں ثقات کی مخالفت کرے۔ اگر وہ مخالفت نہیں کرتا بلکہ صرف ا
اختیار کرتا ہے تو ایسی صورت میں گو اصطلاحاً اس کو شذوذ سے تعبیر کرلیجیے، لیکن یہ روایت مقبول
اور اس کا استرداد جائز نہ ہوگا۔

حاکم کی تعریف میں گھپلا ہے۔ ایک طرف تو وہ حدیث شاذ میں صرف تفرد کو اہم عنصر گردانتے ہیں
اختلاف کا ذکر نہیں کرتے۔ دوسری طرف اس شرط کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ تفرد ایسا ہونا چاہیے کہ جس کی
متابع سے تائید نہ ہوسکے۔ اس شرط کو تسلیم کرلینے کی صورت میں ان کی تعریف اور امام شافعی کی رائے میں
اختلاف نظر نہیں آتا۔ کیونکہ اگر روایت کی تائید کسی متابع سے ہوجاتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ راوی
ثقات کی مخالفت نہیں کی۔ اس طرح امام شافعی اور حاکم کی رائے میں ایک گونہ تماثل پیدا ہوجاتا ہے۔ اس کی
یہ حدیث ہے:

حدثنا ابوبکر محمد بن احمد بن بالویہ قال حدثنا موسی بن ہارون قال حد
قتیبہ بن سعید قال حدثنا اللیث بن سعد عن یزید بن حبیب عن ابی ا
عن معاذ بن جبل ان النبی کان فی غزوۃ تبوک اذا ارتحل قبل زیغ الشم
اخر الظہر حتی یجمعها الی العصر فیصلیہما جمیعاً واذا ارتحل بعد زیغ الش
صلی الظہر والعصر جمیعاً ثم سار وکان اذا ارتحل قبل المغرب اخر الم
حتی یصلیہما مع العشاء واذا ارتحل بعد المغرب عجل العشاء فصلاہا مع المغرب

ہم سے ابوبکر محمد بن احمد بن بالویہ نے حدیث بیان کی، ان کا کہنا ہے کہ ان سے موسیٰ بن ہارون نے حدیث بیا
کا کہنا ہے کہ ہم سے قتیبہ بن سعید نے حدیث بیان کی، ان کا کہنا ہے ہم سے لیث بن سعد نے یزید بن حبیب سے
اور انھوں نے ابوالطفیل سے، اور ابوالطفیل نے معاذ بن جبل سے روایت کی کہ آنحضرت غزوۂ تبوک میں جب سور

سے قبل روانہ ہوتے تو ظہر کو مؤخر کر دیتے اور اس کو عصر کے ساتھ ملا کر پڑھتے اور جب سورج ڈھلنے کے بعد سفر کرتے تو ظہر و عصر ایک ساتھ ادا کر لیتے، اور اس کے بعد روانہ ہوتے، اور جب مغرب سے پہلے روانہ ہوتے تو مغرب کو مؤخر کر دیتے اور مغرب و عشا ملا کر پڑھ لیتے، اور جب مغرب کے بعد سفر کرتے تو عشا میں تعجیل کرتے اور مغرب و عشا ایک ساتھ پڑھ لیتے۔

حاکم کا کہنا ہے کہ یہ حدیث معلول نہیں، اس کے رواۃ کا تعلق آئمہ ثقات سے ہے۔ یہ شاذ اس بنا پر ہے کہ اس متن اور اس سیاق کے ساتھ اصحاب ابو الطفیل سے کوئی روایت مروی نہیں --- ابو یعلیٰ خلیلی نے حدیث شاذ کا اطلاق اس روایت پر کیا ہے، جس کی ایک ہی سند ہو، چاہے اس میں ثقہ کی مخالفت پائی جاتے یا نہ پائی جائے۔ اگر اس میں ثقات کی مخالفت کا پہلو پایا جائے تو اس کے بارے میں توقف اختیار کیا جائے گا اور اس سے استدلال درست نہ ہوگا۔ لیکن اگر اس میں مخالفت تو ہو مگر ثقات کی نہ ہو تو اسے رد کر دیا جائے گا۔ ابن الصلاحؒ اور دوسرے علما نے شاذ کی اس تعریف کو صحیح تسلیم نہیں کیا۔ کیونکہ اس میں مطلقاً تفرد کا اعتبار کیا گیا ہے اور مخالفتِ ثقات کو ضروری نہیں قرار دیا گیا۔

منکر

منکر اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں راوی ضعیف ثقہ کی مخالفت کرے۔ اس اعتبار سے یہ شاذ سے مختلف شئی ہوگی۔ کیونکہ شاذ کے رواۃ ثقہ ہوتے ہیں اور منکر کے ضعیف۔ اس کی مقابل حدیث کو معروف کہیں گے اور شاذ کی مقابل حدیث کو محفوظ۔ مناکیر کے راوی ان احادیث کی مخالفت کرتے ہیں، جو معروف اور مشتہر ہوں۔ جبکہ شاذ حدیث کے رواۃ نہ صرف ثقہ ہوتے ہیں بلکہ ثقاہت کے پہلو بہ پہلو ان کا حافظ و ضابط ہونا بھی ضروری ہے۔

ابن حجر کا کہنا ہے کہ صحیح اور حسن میں زیادت الفاظ مقبول ہے بشرطیکہ یہ زیادت ارجح اور راوی یا زیادہ اوثق رواۃ کے منافی نہ ہو۔ وجوہِ ترجیح میں کئی چیزیں داخل ہیں۔ مثلاً یہ کہ راوی زیادہ ضابط ہو یا اس کی کثیر رواۃ کو پیش کیا جاسکے۔ ان ترجیحات کی حامل حدیث کو محفوظ کہیں گے اور اس کی مقابل کو شاذ۔ لیکن اگر راوی ضعیف ہو، اور اس میں ثقہ کی مخالفت کا پہلو بھی پایا جائے تو یہ روایت منکر کہلائے گی، اور اس کی مقابل کو معروف کہا جائے گا۔

ابن الصلاح کی رائے میں منکر و شاذ مترادف اصطلاحیں ہیں۔ چنانچہ انھوں نے البرد یجی کے اس قول کو نقل کیا ہے کہ منکر وہ حدیث ہے جس کی روایت میں راوی متفرد ہو، اور جس متن کی وہ روایت کرے وہ

طرقِ حدیث میں سے کسی طریق سے بھی معروف نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں البرد یجی کے نزدیک منکر میں صرف تفرد کا اعتبار ہے۔ حالانکہ مطلقاً تفرد مردود نہیں ہوتا، بلکہ جب یہ تفرد ثقات کی مخالفت پر مبنی ہوگا تب مردود و شاذ ہوگا۔ لیکن اگر صورتِ حال یہ ہو کہ وہ روایت میں صرف ان معنوں میں متفرد ہے کہ اس کو اس کے سوا کسی اور نے روایت نہیں کیا تو دیکھا جائے گا کہ اگر راوی تفرد کے باوجود عادل و ضابط ہے تو اس کی روایت مقبول ہوگی، اور انفراد اس کی صحت پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ لیکن اگر راوی کا عدل و ضبط محلِ نظر اور مشکوک ہو تو اس کو صحیح کے دائرے میں نہیں شمار کیا جائے گا۔

سیوطی نے منکر و شاذ کو مترادف نہیں قرار دیا۔ ان کے نزدیک ابن الصلاح اس بارے حق و صواب کی راہ سے ہٹ گئے ہیں، کیونکہ دونوں میں بیّن فرق پایا جاتا ہے۔

منکر کی مثال یہ حدیث ہے،

عن ابی اسحٰق عن العیزار بن حریث عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم، من اقام الصلوٰۃ واٰتی الزکوٰۃ وحج البیت وصام وقری الضیف دخل الجنۃ۔

ابی اسحاق سے روایت ہے انھوں نے العیزار بن حریث سے روایت کی اور انھوں نے عباس سے یہ کہ آنحضرت نے فرمایا جس شخص نے نماز قائم کی، زکوٰۃ دی، بیت اللہ کا حج کیا اور مہمان نوازی کی، وہ جنت میں داخل ہوگیا۔

ابو حاتم کا کہنا ہے کہ یہ حدیث اس لیے منکر ہے کہ دوسرے ثقات نے اس کو اسحاق سے موقوفاً روایت کیا ہے۔

کیا احادیثِ موقوفہ یا مقطوعہ کو ضعیف سمجھا جائے گا؟

موقوف سے مراد ایسی روایات ہیں جو صحابہ سے منقول ہوں، چاہے وہ قولی ہوں یا تقریری ہوں یا فعلی۔ مثلاً راوی یہ کہے کہ عمر بن خطاب نے کہا، یا علی بن ابی طالب نے یوں کہا۔ یا فلاں فعل ابو بکر کے سامنے ہوا اور اس پر انھوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ایسی روایات کا درجہ وہ تو ہرگز نہیں ہو سکتا جو احادیثِ مرفوعہ کا ہے، لیکن کیا یہ روایات علی الاطلاق ضعاف کے دائرہ میں داخل ہیں۔ یہ بات صحیح نہیں۔ اگر ان میں شرائطِ صحت یا شرائطِ حسن کا التزام کیا گیا ہے، تو ہم انھیں روایاتِ صحیحہ تو بہرحال قرار دیں گے۔ رہا یہ سوال کہ کیا ایسی روایات پر عمل کیا جائے گا یا نہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر احادیث اس نوعیت کی ہیں کہ ان کا تعلق رائے و اختیار سے نہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ انھیں قابلِ عمل نہ ٹھہرایا جائے۔ کیونکہ صحابہ کی عادت یہ تھی کہ جب تک وہ آنحضرت سے کوئی بات براہِ راست سن نہ لیں، اس طرح کی چیزیں اپنی طرف سے

شرعیات میں کچھ نہیں کہتے تھے۔ اس کی مثال عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ روایت ہے:

من اتی عرافا او کاھنا فقد کفر بما انزل علی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

جو عراف وکاہن کے پاس گیا، اس نے آنحضرت کی تعلیمات کا انکار کیا۔

یہ حدیث موقوف ہے لیکن اسلام کی روح توجیہ کے عین مطابق ہے۔ البتہ جن صحابہ نے اسرائیلیات کی کثرت سے روایت کی ہے، جیسے کعب احبار وغیرہ، ان کی روایات کے ردو قبول میں احتیاط کی ضرورت ہے، یا جن روایات میں علاماتِ قیامت اور فتن آخرالزماں کے بارے میں عجیب وغریب باتیں بیان کی گئی ہیں، ان سے متعلق محتاط رویہ اختیار کرنا پڑے گا۔ یعنی ایسی موقوف روایات کی جانچ پرکھ کی جائے گی اور دیکھا جائے گا کہ ان کی اسناد یا متن میں کہیں تعلیل، شذوذ اور اضطراب تو پایا نہیں جاتا۔ کیونکہ کسی حدیث کا مطلقاً موقوف ہونا اس بات پر دلالت کناں نہیں کہ یہ ضعیف بھی ہے۔

ان احادیث کو ہم مرفوع کے دائرے میں شمار نہیں کر سکتے جن کا تعلق آیات کی تفسیر سے ہے، اس لیے کہ تفسیر کے باب میں صحابہ نے اجتہاد سے کام لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فروع مسائل میں ان کے ہاں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کو اس بنا پر ترجیح حاصل ہوگی کہ ان کا تعلق صحابہ کے فہم وذوق سے ہے۔

منقطع اس حدیث کو کہتے ہیں جو تابعین سے منقول ہو۔ اس کے بارے میں امام ابوحنیفہ کی دو ٹوک رائے یہ ہے کہ:

ماجاء عن الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) فعلی الراس و العین وماجاء عن الصحابی تخیرنا منه واما ماجاء عن التابعین فهم رجال ونحن رجال۔

جو آنحضرتؐ سے مروی ہو وہ سر آنکھوں پر، جو صحابہ سے منقول ہو اس میں ہم قولِ مختار کو لیں گے، اور تابعین کی روایات کے بارے میں ہماری روش یہ ہے کہ ہم ان کے رد و اختیار کے معاملے میں آزاد ہیں کیونکہ وہ بھی انسان تھے اور ہم بھی انسان ہیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ حدیثِ منقطع کو ضعیف گردانتے ہیں اور اسے حجت قرار نہیں دیتے۔ اسی وجہ سے اصحاب رائے نے منقطع کے مقابلے میں قیاس پر عمل کرنے کو ترجیح دی ہے۔ لیکن اس باب میں صحیح اور متوازن رائے یہ ہے کہ منقطعات کو مطلقاً رد نہ کیا جائے، بلکہ اس کی سند و متن کی تحقیق کی جائے۔ اگر ان روایات کا تعلق اکابر تابعین سے ہو جیسے سعید بن مسیب، شعبی، نخعی اور مسروق سے تو ان کو قطعاً نا

کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے کیونکہ یہ وہ حضرات ہیں جن کو صحابہ کی معاصرت کا شرف حاصل ہے۔

ضعیف احادیث کے بارے میں اس عبارت سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں کہ:

یجوز العمل بالضعیف فی فضائل الاعمال

کہ فضائل اعمال سے متعلق ضعیف احادیث بھی قابلِ عمل ہیں۔

اس سے تعلیماتِ اسلامی میں بہت سی ایسی چیزیں داخل ہوگئیں جن کی کوئی بنیاد اور اساس نہیں ہے۔ یہ عبارت دراصل صدائے بازگشت ہے، احمد بن حنبل، عبدالرحمٰن بن مہدی اور عبداللہ بن مبارک کے اس قول کی:

اذا روینا فی الحلال والحرام شددنا واذا روینا فی الفضائل ونحوھا تساھلنا۔

کہ جب ہم حلال حرام کی بات کرتے ہیں تو روایات کے رد و قبول میں سختی سے کام لیتے ہیں۔ لیکن جب فضائلِ اعمال کی گفتگو کرتے ہیں تو روایت میں تساہل برتتے ہیں۔

لیکن ان بزرگوں کے اس قول کا صحیح حل تلاش نہیں کیا گیا۔ اصل میں وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ جہاں حلال حرام کا معاملہ ہو، ہم انتہا درجے کی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ لیکن اگر بحث فضائل اعمال وغیرہ کی ہو تو ہم تحقیق تفحص کے پیمانوں میں زیادہ سختی روا نہیں رکھتے۔ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ فضائل اعمال کے بارے میں صحیح سے کم درجے کی روایات کو بھی ہم قبول کر لیتے ہیں۔ یہ نہیں کہ جو حدیث متن و اسناد کے اعتبار سے ضعیف ثابت ہو چکی ہو اس کو شائستہ عمل قرار دیتے ہیں۔

اس بحث میں دو نکتے قابلِ لحاظ ہیں۔ ایک یہ کہ احادیثِ ضعیفہ کو دین کا مآخذ و مبنی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ دوسرے یہ کہ فضائل اعمال سے متعلق صحیح روایات کا ذخیرہ کیا کم ہے، جو ان کے ثبوت کے لیے ضعیف احادیث کی آڑ لی جائے۔

جن لوگوں نے ضعیف احادیث کو بھی قابلِ عمل ٹھہرایا ہے، انھوں نے اس کے لیے تین شرطیں پیش کی ہیں۔

(۱) روایت میں شدید قسم کا ضعف نہ ہو۔

(۲) روایت کسی ایسے کلی اور جامع حکم سے ہم آہنگ ہو جو کتاب و سنت سے ثابت ہو۔

(۳) اس سے زیادہ قوی دلیل اس کے منافی نہ ہو۔

لیکن سوال یہ ہے کہ جب کسی روایت کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ یہ متن و اسناد کے اعتبار سے ضعیف

ہو تو اس کو حدیثِ رسول کہہ کر ذکر کر سکتے ہیں۔ ہاں یہ البتہ درست ہے کہ اس نوع کی احادیث سے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرت سے یہ اس طرح مروی ہے یا ہم تک یہ روایت اس طرح پہنچی ہے۔ یعنی بصیغۂ تمریض تو اس کو آنحضرت کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے، جزم و یقین کے اسلوب میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ حدیثِ رسول ہے۔

معنعن

جیساکہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اس کے معنی ایسی روایت کے ہیں جس میں روایت کا انداز یہ ہو "فلان عن فلان" یعنی فلاں راوی نے فلاں راوی سے روایت کی۔ اس کو متصل کے قبیل سے سمجھنا چاہیے، بشرطیکہ اس میں سہ گونہ شرائط پائی جائیں۔

(۱) رواۃ کی عدالت

(۲) لقائے راوی کا ثبوت اور

(۳) تدلیس سے براءت

صحیحین میں معنعن کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ خصوصیت سے صحیح مسلم میں اس کا التزام زیادہ ہے، کیونکہ امام مسلم نے رواۃ کی معاصرت کو کافی سمجھا ہے بشرطیکہ وہ معتبر ہوں اور لقائے راوی کو صحت کی شرط قرار نہیں دیا۔ امام مسلم کی اس باب میں کسی نے تائید نہیں کی بلکہ اس پر تنقید کی ہے۔ ابن الصلاح کا کہنا ہے کہ مسلم نے جس قول کو مردود قرار دیا ہے، وہی ائمۂ حدیث جیسے علی بن مدینی اور بخاری کے نزدیک مقبول و مختار ہے۔ نووی نے اس سے بھی زیادہ صاف لفظوں میں کہا ہے کہ مسلم کی رائے پر محققینِ علومِ حدیث نے بہت لے دے کی ہے، اور ان کی یہ رائے کمزور ہے اور اس بارے میں صحیح اور پسندیدہ رائے وہی ہے جس کو اس فن کے ائمہ نے تسلیم کیا ہے۔ یعنی صحت رواۃ کے لیے صرف معاصرت رواۃ کافی نہیں بلکہ راوی اور مروی عنہ میں لقا و تحدیث کا ہونا ضروری ہے۔

بعض نقادانِ فن نے معنعن روایت کو مرسل کے مترادف ٹھہرایا ہے اور اسے حجت نہیں مانا لیکن ایک گروہ نے اس کے علی الرغم اس کو حجت تسلیم کیا ہے۔ ان کے نقطۂ نگاہ سے اگر مراسیل کا تعلق ان صحابہ سے ہو، جن کو کثرت سے شرفِ صحابیت حاصل ہو، جیسے حضرت عمر کی مراسیل ہیں، تو ان کو سماع و لقا ہی پر محمول کیا جائے گا، اور اس کی پروا نہیں کی جائے گی کہ انھوں نے "سمعت" کا لفظ استعمال کیا یا

ال رسول اللہ کہا، یا عن رسول اللہ کا پیرایہ بیان استعمال کیا۔ کیونکہ صحابہ متاخرین کی ان اصطلاحات سے ناآشنا تھے۔ علامہ نووی نے تصریح کی ہے کہ معنعن احادیث کو مراسیل کے زمرے میں شمار کرنا غلط ہے۔

صحیح مسلم میں معنعن روایات کی کثرت کی یہ تاویل کی گئی ہے کہ مستخرجات میں بالعموم اور صحیح مسلم میں بالخصوص ایسے طرق کا بھی ذکر ہے، جن میں تحدیث و سماع کی تصریح موجود ہے۔

حافظ ابن حجر کی رائے اس سلسلے میں زیادہ جامعیت لیے ہوئے ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کبھی تو معنعن روایت "حدثنا" کے مرتبے کی ہوتی ہے اور کبھی اس مرتبے کی نہیں ہوتی، جبکہ اس کا صدور ایسے راوی سے ہو جو مدلس ہے، اور کبھی اس سے مراد، ایسی روایت ہوتی ہے جو "اخبرنا" کے ضمن میں آتی ہے۔ اس سے اس کے اتصال کی نفی نہیں ہوتی، لیکن اس سے سماع کا ثابت ہونا بھی ضروری نہیں۔

حدیث مؤنن

حدیث مؤنن اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں راوی "حدثنا فلان ان فلاناً" کا لفظ استعمال کرے۔ امام مالک نے اسے معنعن کے ضمن میں شمار کیا ہے۔ جب کہ راوی "عن فلان انہ قال کذا" کے انداز کے الفاظ استعمال کرے۔ البردیجی نے ایسی روایت کو انقطاع پر محمول کیا ہے۔ ہاں اگر کسی دوسرے طریق روایت سے سماع کی وضاحت ہو جائے تو اس صورت میں انقطاع زائل ہو جائے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ راوی تحدیث کے لیے مختلف پیرایۂ بیان سے کام لیتے ہیں اور اختلاف کا منشا محض عرف و عادت کا اختلاف ہے۔ حقیقت کا اختلاف نہیں۔

(ماخذ: علوم الحدیث ومصطلحہ تالیف ڈکتور صبحی الصالح)